

جواد ایس خواجہ، جج: میں نے فاضل چیف جسٹس صاحب کے تفصیلی فیصلے اور جسٹس خلیجی عارف حسین صاحب کے اضافی نوٹ سے استفادہ کیا ہے۔ میں ان سے متفق ہوں اور خود یہ اضافی نوٹ آئین کے چند اصولوں کی تشریح کے لئے لکھ رہا ہوں۔ ہمارے سامنے پیش ہونے والے وکلاء نے ان اصولوں سے صرف نظر کیا۔ ان آئینی اصولوں کی وضاحت اس موقع پر لازم ہے۔

2۔ فاضل اٹارنی جنرل نے، اور مسؤل علیہان کے بعض وکلاء نے جو بحث کی، اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کے نزدیک صرف منتخب نمائندے ہی عوام کی منشاء کے بلا شرکت غیرے ترجمان ہیں اور اس اعتبار سے یہ منتخب نمائندے ریاست کے کسی بھی اور عضو بشمول عدالت کے سامنے جوابدہ نہیں۔ اس بناء پر ان فاضل وکلاء نے آئین کے آرٹیکل 69 پر انحصار کیا ہے جو کہ قطعاً بے محال ہے۔ آئین کی نظر میں یہ بات درست نہیں ہے۔ چیف جسٹس صاحب نے اپنے فیصلے میں اور میں نے ذیل میں اس بات کا جائزہ لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں انتظامیہ اور پارلیمان کے ممبران بھی آئین کے تابع ہیں اور اُس سے بالاتر نہیں۔ آئین ریاست کے ہر عضو پر فائق ہے اور آئین کو یہ فوقیت اس لیے حاصل ہے کہ آئین ہی عوام کی منشاء کا حقیقی ترجمان ہے۔ آئین کی یہ صفت آئین ہی کے الفاظ سے جھلکتی ہے۔ مثلاً ابتدائیہ (Preamble) آئین میں یہ درج ہے کہ "یہ آئینی نظام پاکستان کے عوام کی منشاء کا مظہر ہے۔ مزید برآں آئین کے تیسرے جدول میں یہ بات اور بھی صراحت سے درج ہے "آئین عوام کی منشاء کا پیکر (embodiment) ہے۔" یہ بنیادی اصول ہمارے آئینی جمہوری نظام کا طرہ امتیاز ہے۔

3۔ اسی عدالت کی ایک نظیر میں عدالت واضح کر چکی ہے کہ "جب تک ریاست کے تینوں اعضاء اپنی آئینی حدود کے اندر رہ کر کام کرتے رہیں گے، تینوں عوام کی منشاء کے ترجمان گردانے جائیں گے۔ یہ اس لئے کہ ہمارے آئین میں جس نظام کا تصور پیش کیا گیا ہے، اس میں ریاست کے تینوں اعضاء ہم پلہ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے انداز میں، یعنی ایک قانون سازی کے ذریعے، ایک انتظامی اقدامات کے ذریعے اور ایک تشریح آئین و قانون کے ذریعے، عوام کی منشاء کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ انتظامیہ اور عدلیہ، دونوں پر آئین کی فوقیت و حاکمیت کو تسلیم کیا جائے۔" (سید یوسف رضا گیلانی بنام اسٹنٹ رجسٹرار سپریم کورٹ آف

پاکستان (PLD 2012 SC 466, Para 34)۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ عدلیہ عوام کی منشاء کا ادراک کیسے کرتی ہے؟ عوام کی منشاء کا ادراک کرنے کے لئے ہمیں، بطور عدالت، کسی سیاسی فلسفے یا دنیا کے دیگر ممالک کے قانونی منظر نامے کا جائزہ لینے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف آئین کے متن کا جائزہ درکار ہے تاکہ پاکستان کے عوام، جو اس ملک میں سیاسی حاکمیت کے حقیقی امین ہیں، اُن کی منشاء کا احترام ہو بالآخر یہی جمہوریت کا خاصہ ہے۔

4۔ جب ہم آئین کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم پر واضح ہو جاتا ہے کہ عوام نے ایک ایسا نظام اپنے لئے اختیار کیا ہے جس میں پارلیمان، عدلیہ اور انتظامیہ کے درمیان طاقت اور اختیارات کا توازن قائم کیا گیا ہے۔ عوام نے حدود و قیود پر مبنی یہ طرز حکومت اس لیے چنا ہے کہ اس کے پس پردہ بڑی حکمت ہے۔ اس حکمت کی صراحت ایک عظیم مفکر کی زبانی بیان کرتے ہیں: ”اگر انسان فرشتے ہوتے، تو حکومت کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ اور اگر فرشتے ہمارے حکمران ہوتے تو حکومت پر داخلی اور بیرونی حدود و قیود عائد کرنے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی۔ مگر جہاں انسانوں پر حکومت انسانوں ہی نے کرنی ہے، وہاں نظام حکومت قائم کرتے وقت دو اہم تقاضوں کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔ اول یہ کہ حکومت با اثر ہو اور شہریوں پر اختیار رکھتی ہو، اور دوم یہ کہ وہ خود ایک نظم و ضبط کی تابع ہو۔ اس دوسرے مقصد کے حصول کا اہم ترین طریقہ تو یہ ہے کہ حکومت عوام کی (تائید کی) محتاج رہے، مگر تاریخ کے تجربے نے معاشرے کو یہ سبق دیا ہے کہ اس کے علاوہ کچھ ”ثانوی اقدامات“ بھی از حد ضروری ہیں۔“ (جیمز میڈلسن، فیڈرسلٹ نمبر 51، فیڈرلسز پیپرز)۔ ہمارے آئین میں ان ثانوی اقدامات میں سے اہم ترین اقدام آئینی اداروں کی سہ فریقی تقسیم ہے، جو حکومت کو کچھ حدود و قیود کا پابند رکھے۔ عوام کا حکم ریاست کے سب اعضاء کے لیے یہ ہے کہ وہ آئینی حدود کے پابند رہیں۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لئے آئین میں ایک سادہ اور موثر طریق کار بھی وضع کر دیا گیا ہے، جس کے بارے میں کوئی ابہام نہیں ہو سکتا۔ ذیل میں اب اس طریق کار کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔

5۔ کیونکہ آئین کے تحت مادی اور مالی وسائل انتظامیہ کے سپرد کئے گئے ہیں، اس لئے آئین میں یہ بھی درج ہے کہ ”پاکستان کے تمام انتظامی (Executive) اور عدالتی ادارے سپریم کورٹ

کی معاونت کرے پابند ہوں گے“ (آرٹیکل 190)۔ سپریم کورٹ کو بااختیار رکھنے کی خاطر آئین نے عدالتی احکامات اور فیصلوں کے اطلاق کا موثر انتظام کیا ہے۔ عوام کی منشاء یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے احکامات کا نفاذ انتظامیہ کی ذمہ داری ہے اور یہی منشاء بطور حکم آرٹیکل 190 میں وضاحت سے درج ہے۔ انتظامیہ کی جانب سے اس حکم کے اطلاق کو یقینی بنانے کی خاطر عوام نے یہ بات بھی آئین میں لکھ دی ہے کہ "اگر کوئی شخص عدالت کے حکم سے روگردانی کرے، عدالت کو بدنام کرے یا کوئی بھی ایسا عمل کرے جس سے عدالت توہین، تضحیک یا عداوت کا نشانہ بنے، تو عدالت ایسے شخص کو سزا دینے کی مجاز ہے (آرٹیکل 204)۔ اس امر کو یقینی بنانے کی خاطر کہ پارلیمنٹ کا کوئی ممبر (بشمول وزیراعظم) سپریم کورٹ کی معاونت کے آئینی فریضے سے روگردانی نہ کر سکے، عوام نے آئین میں یہ بھی درج کر دیا ہے "اگر کوئی شخص مجاز عدالت سے اس جرم میں سزا یافتہ قرار پاتا ہے کہ اس نے کوئی ایسا اقدام اٹھا یا جس سے عدلیہ کی بدنامی یا تضحیک ہوئی، تو وہ پارلیمنٹ کا ممبر بننے سے اور ممبر رہنے کا، نا اہل ہو جائے گا" (آرٹیکل (g)(1) 63)۔ بالفاظ دیگر، عوام نے صراحتاً اس منشاء کا اظہار کیا ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو اپنا نمائندہ نہیں دیکھنا چاہتے جو آرٹیکل 63 میں دی گئی مذکورہ شرط کے تحت نا اہل قرار پا چکا ہو۔ جیسا کہ فاضل چیف جسٹس کے فیصلے میں بھی لکھا ہے، جناب یوسف رضا گیلانی کو عدالت کے ساتھ رکنی بیچ نے اس حوالے سے سزا دی ہے۔ اب اگر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس سزا کے باوجود پارلیمنٹ کی رکنیت کے اہل ہیں، تو یہ دعویٰ آئین کے منافی ہے۔ آرٹیکل 63، 190 اور 204 کا مجموعی نتیجہ عیاں ہے۔ ان شقوں کے ذریعہ عوام کی ہدایات جو کہ آئین میں درج ہیں، کا موثر انداز میں نفاذ ممکن بنایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا اہم اور منفرد آئینی نقطہ ہے جو کہ دنیا کے بیشتر دیگر ممالک میں نہیں ملتا۔

6۔ اس بنیادی جمہوری اور آئینی تصور کی تشریح ایک مثال سے کی جاسکتی ہے۔ بالفرض پارلیمنٹ کا کوئی رکن آئین سے روگردانی کرتے ہوئے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر دے، اور عدالت کے روکنے پر بھی نہ رُکے، تو پھر عوام کی منشاء یہی ہے کہ اُسے آرٹیکل 204 کے تحت سزا دی جائے۔ اسی آئینی اختیار کی بدولت عدالت خاموش نہیں رہ سکتی۔ عدالت عوام کے حقوق کی محافظ ہے۔ کوئی رکن پارلیمنٹ جسے عوام ہی نے منتخب کیا تھا، اگر وہ آئین سے روگردانی کا مرتکب ہو، تو اُسے روکنا عدالت کا اختیار ہے اور فرض بھی۔ یوں ایک سادہ اور موثر سا نظام وجود میں آ جاتا ہے، جس میں طاقت کی کنجیاں بالآخر عوام ہی کے ہاتھ میں رہتی ہیں۔ اس آئینی نظام کے ذریعے عوام کا یہ واضح پیغام ہے کہ "یا تو ہماری منشاء (جو آئین میں منعکس ہے) کی پابندی کرو۔ ورنہ

ہماری نمائندگی کے شرف سے دستبردار ہو جاؤ!“ یہ پیغام نہایت واضح اور معقول ہے۔

7۔ آئین کے مطابق سپریم کورٹ آئینی جمہوریت کا بنیادی ستون ہے۔ اس مقدمہ میں تو عدالت نے منتخب نمائندگان کو آئین میں درج عوام کی منشاء کا پابند بنانے کے لئے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ توہین عدالت کے قانون کو اس تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس قانون سے عدالتوں یا ججوں کی انا کی تسکین مقصود نہیں۔ بلکہ اس مقدمے میں اس قانون کا استعمال عوام کی منشاء یعنی آئین پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لئے کیا گیا۔ یہ دلیل کہ عدالت عوامی امنگوں کی ترجمان اور نمائندہ نہیں ہے، انہی مندرجہ بالا وجوہ کی بناء پر رد کی جاسکتی ہے۔ دراصل یہ استدعا خصوصی مراعات کے تقاضے کے مترادف ہے۔ عدالت ایک گزشتہ فیصلے میں ایسے ہی تقاضے کو رد کر چکی ہے۔ اُس مقدمے میں قانون کے سامنے ہر شخص کی برابری کے آئینی اصول کے بارے میں عدالت نے لکھا تھا کہ ”ہمارے بانی اسلاف کے یہ نظریات درحقیقت عصر حاضر کے پیرائے میں اُس ازلی حکمت کا تسلسل ہیں، جو سید القوم خادمہم (قوم کے سردار اُن کے خادم ہوتے ہیں) میں بیان ہوئے تھے۔ ہمارا آئین اسی اصول کا مجسم ہے، کیونکہ وہ ملک کے اعلیٰ ترین انتظامی عہدے دار پر یہ ذمہ داری ڈالتا ہے۔۔۔“ (سید یوسف رضا گیلانی بنام اسٹنٹ رجسٹرار، پیرا نمبر 25)۔ اُس سے بھی پہلے ایک اور مقدمے میں عدالت یہ واضح کر چکی ہے کہ ریاست کے تمام اعضاء اور اُن کے تمام عہدے داروں کا مقصد وجود اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ آئین اور قانون میں منعکس عوام کی منشاء پر عمل درآمد کو یقینی بنائیں۔ محمد یاسین بنام وفاق پاکستان میں چیئرمین ”اوگرا“ کی اپنے عہدے کے لئے اہلیت کا جائزہ لیتے ہوئے، عدالت نے لکھا تھا کہ ”۔۔۔ عدالت تمام سرکاری عہدہ داران کو باور کرانا چاہتی ہے کہ جس آئینی نظام میں وہ اپنے منصب پر فائز ہیں اُس کی بنیاد عوام کے بنائے ہوئے آئین پر ہے۔ اور ان کی تنخواہیں اور مراعات بھی بالآخر عوام ہی کی جیب سے آتی ہیں۔ اسی لئے انہیں ہر صورت میں عوام کی وفاداری اور عوام کے مفاد کے تحفظ کی سعی کرنی چاہیئے۔“ آج ریاست کے اعلیٰ ترین عہدہ دار کی نسبت سے ابھرنے والے اس مقدمے میں عدالت کے پاس پہلے بیان کئے گئے اس اصول سے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں۔

8۔ یہ بھی یاد رہے کہ ریاست کے تمام اداروں پر لازم ہے کہ وہ ہم آہنگی کا مظاہرہ کریں۔ زیر نظر مقدمہ میں

ہمارے پیش نظر مسئلہ نہ تو کسی فرد کی انا کا ہے نہ کسی ادارے کی انا کا۔ منیر بھٹی کے مقدمے میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ "جمہوری نظام میں آئینی اور ریاستی اداروں کے مابین آئینی معاملات پر اختلاف رائے کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔۔۔ لیکن جوں جوں قومیں پختہ اور اُن کے سیاسی نظام ارتقاء پذیر ہوتے ہیں، ان کی بالغ نظری کی جھلک میثاقِ حکومت یعنی آئین سے متعلقہ تنازعوں کے حل کے طریقے میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ تنازعہ دو فریقوں کے درمیان تصادم یا انا کی جنگ نہیں ہے۔" منیر بھٹی بنام وفاق پاکستان (PLD 2011 SC 407)۔

9۔ ہم بارہا یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ جب تک ملک میں آئین کی پاسداری کی جاتی رہے گی، یہاں عدم استحکام کا کوئی خطرہ نہیں۔ ہم جس نظام کا حصہ ہیں وہاں حکومت قانون کی ہے، نہ کہ افراد کی۔ کوئی بھی فرد چاہے وہ وزیراعظم ہی کیوں نہ ہو نظام کی بقاء کے لئے ناگزیر نہیں۔ آج کوئی اس جہاں میں ہے تو کیا معلوم کل کسی اور جہاں میں ہو۔ اقبال نے کیا خوب کہا تھا: "ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں۔" یوسف رضا گیلانی بنام اسسٹنٹ رجسٹرار سپریم کورٹ کے مقدمے میں ہم لکھ چکے ہیں۔ "جب تک ریاستی ادارے آئین پر عمل پیرا ہیں، کسی فرد واحد کا وجود نظام کی بقاء کے لیے اہمیت نہیں رکھتا۔ افراد کی بجائے اداروں کے احترام پر مبنی آئینی نظام میں "میں نہیں، تو کچھ نہیں" کے فرسودہ تصور کی کوئی گنجائش نہیں" (یوسف رضا گیلانی بنام اسسٹنٹ رجسٹرار سپریم کورٹ)۔ گزشتہ چند ہفتوں کے واقعات سے اس بات کی عملی تصدیق ہوئی ہے۔ آئین سے روگردانی کے مرتکب ایک وزیراعظم کے درخواست ہونے اور پارلیمان کی جانب سے ایک نئے وزیراعظم کے انتخاب سے، اور اس طرح ریاستی امور میں آئینی انداز میں تبدیلی آنے سے آئین کی فوقیت کے تصور کو تقویت ملی ہے۔ یاد رہے کہ آئین ہی، جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں، عوام کی منشاء کا اصل مظہر اور جمہوریت کا ضامن ہے۔

10۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ آرٹیکل (1) 63 کی ذیلی شق (g) میں سال 2010 میں اٹھارویں ترمیم کے تحت ترمیم کی گئی تھی۔ یہ ترمیم موجودہ مقدمے کے تناظر میں خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ مگر یہ نکتہ شاید فاضل اٹارنی جنرل اور مسئول علیہان کے فاضل وکلاء کی نظر سے نہیں گزرا۔ واقعہ یوں ہے کہ اٹھارویں ترمیم سے پہلے تو بین عدالت سے متعلقہ اس شق میں "مجاز عدالت سے سزا یافتہ" ہونے کی شرط نہیں تھی۔ اس وجہ سے سپیکر کو اختیار تھا کہ اس بات کا تعین کرے کہ کسی رکن اسمبلی کی اہلیت کا سوال اٹھتا ہے یا نہیں۔ مگر اب جب کہ اس شق میں "مجاز

عدالت سے سزا یافتہ“ ہونے کی شرط کا صراحتاً اضافہ کر دیا گیا ہے، تو پھر سپیکر قومی اسمبلی کی اس معاملہ میں کوئی صوابدید باقی نہیں رہتی۔ مزید برآں سات رکنی بینچ کے فیصلے سے یہ واضح ہے کہ سید یوسف رضا گیلانی کا جرم آرٹیکل (g) (1) 63 میں بیان کردہ شرائط کے زمرہ میں آتا ہے۔ اس طرح یہ بھی قابل غور ہے کہ فاضل اٹارنی جنرل اور مسئول علیہ کے فاضل وکیل نے عدالت کے روبرو جو دلائل پیش کئے اُن دلائل کا ایک بڑا حصہ سات رکنی بینچ کے فیصلہ میں مبینہ سقم اجاگر کرنے پر مبنی تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بحث اس مرحلے پر بالکل لا حاصل تھی۔ جب سات رکنی بینچ کے اس فیصلے پر اپیل کی مہلت گزر چکی ہے اور فیصلہ حتمی ہو چکا ہے، تو پھر اس فیصلے پر نظر ثانی کے نہ ہم مجاز ہیں اور نہ ہی محترمہ سپیکر اس کی مجاز تھیں۔

11۔ اس نوٹ کے اختتام پر ایک آخری نکتہ کا بیان مناسب ہے۔ ہمارے آئینی منظر نامہ کو برطانوی مفکر ڈائسی (Dicey) سے مستعار لئے گئے پارلیمانی بالادستی کے تصور سے پرانگندہ کرنا مناسب نہیں۔ پارلیمانی بالادستی کا یہ تصور ہمارے آئین کے مزاج سے موافقت نہیں رکھتا۔ بلکہ اب تو یہ تصور اُس جزیرے میں بھی رائج نہیں رہا جہاں سے کبھی اس کا ظہور ہوا تھا۔ برطانیہ کی اعلیٰ ترین عدالت کے ایک حالیہ فیصلے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ ”کہا جا سکتا ہے کہ ڈائسی نے پارلیمانی بالادستی کا جو خالص اور مطلق العنان تصور پیش کیا تھا، وہ کلاسیکی تصور عہد حاضر کے برطانیہ میں بے محل ہے۔“ (لارڈسٹائن، ہاؤس آف لارڈز، جیکسن و دیگر بنام اٹارنی جنرل [560 UKHL (2005)]۔ بہتر ہوگا کہ اب جب کہ ہمیں آزادی حاصل کئے ہوئے چھ دہائیوں سے زیادہ بیت چکی ہیں، ہم بھی سات سمندر پار اُس جزیرے کی متروک روایات و نظریات کی ذہنی غلامی چھوڑ دیں۔ آئینی معاملات کے تصفیہ میں ہم خود کو صرف اس آئین کا پابند جانیں جو ہمارا اپنا ہے، اور جسے پاکستان کے عوام نے اپنے خون اور پسینے سے سینچا ہے۔









